تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ قریش مکہ نے اندر ہی اندر یثرب کے یہودیوں سے سازش کرنی شروع کر دی اور جب خفیہ طور پر ان کو اپنے ساتھ ملا چکے تب اپنی کامیابی پر پورا بھروسہ کر کے مسلمانوں کو کہلا بھیجا۔ "تم مغرور نہ ہونا کہ مکہ سے صاف بچ کر نکل آئے ہم یثرب ہی پہنچ کر تمہارا ستیاناس کیے دیتے ہیں۔ اس پیغام کے بعد انھوں نے چھیڑ خانی شروع کر دی" (رحمۃ للعالمین جلد اول ص۱۱۱) ص۱۵۲ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ "ہم نے اس جنگ (احزاب) کو یہودیوں کی جنگ شمار کیا ہے کیونکہ یہودی ہی تمام قبائل کو اشتعال دلاتے اور مدینہ پر چڑھا کر لانے والے تھے"۔ اگر میثاقِ مدینہ واقعی اسلامی مملکت کی آئین کی قسم کی دستاویز ہوتی اور اسلامی مملکت میں واقعی لوگوں (بشمول یہودیوں) کی رضا کو زبردست اہمیت حاصل تھی تو یہودیوں کا قبیلہ بذاتِ خود جلا وطنی کی درخواست کی بجائے حزبِ اختلاف بننے کی درخواست کرتا نہ کہ خیبر جا کر مسلمانوں کے خلاف تمام قبائل کو حملہ کرنے کے لیے اکساتا۔

جمہوریت کو اسلامی بنانے کی کوشش

ہمارے ہاں جمہوریت نواز ایک ایسا طبقہ بھی موجود ہے جو ساتویں اور بیسویں صدی کے سیاسی نظاموں میں فرق تو محسوس کرتا ہے لیکن اس کے نزدیک یہ فرق معمولی ہے اس لیے اس کے خیال میں دورِ حاضر کے سیاسی نظام میں مناسب ردوبدل کر کے ساتویں صدی کا معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ شریعت بنچ میں اس طبقہ کی نمائندگی مولانا عبدالستار نیازی نے کی ہے ان کا دعویٰ ہے کہ سورت النساء کی آیت نمبر ۵۸ میں "امانت سے مراد یہاں حق رائے دہی ہے یا بالفاظِ دیگر مجلسِ شوریٰ کا منصب اللہ تعالیٰ نے تمام اہلِ ایمان سے جو عاقل و بالغ ہوں، خطاب فرمایا ہے"۔ یہ آیت بیسویں صدی میں نہیں بلکہ ساتویں صدی میں نازل ہوئی ہے اور اس میں امانت کی وہی مراد درست ہوگی جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور صحابہ کرام نے اخذ کی ہے۔ اگر صحابہ کرام امانت سے بالغ رائے کے وہی ہی مراد لیتے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ حق بالغ رائے دہی کو نظر انداز کر کے اپنے طور پر حضرت عمر فاروقؓ اپنا جانشین نامزد نہ فرماتے۔ اس نامزدگی پر اعتراض کرنے والے (حضرت طلحہؓ اور بعض انصار و مہاجرین) حضرت عمرؓ کی سخت گیری کی بجائے یہ کہتے کہ انھیں "نامزد کرنے کا حق حاصل نہیں کیونکہ کسی کو خلیفہ بنانا تمام مسلمانوں کا حق ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ اور بعض دیگر اصحاب حضرت عمرؓ کو کبھی ایسے نہ کہتے کہ کسی کو خلیفہ مقرر کر جائیں۔ حضرت عمر فاروقؓ

بالغ رائے دہی سے صرف نظر کر کے شوریٰ کو چھ اصحاب میں محدود نہ کرتے۔ یہ چھ اصحاب حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو فیصلہ کُن حیثیت کا حامل قرار نہ دیتے اور حضرت علیؓ مرتضیٰؓ تمام اہل ایمان کے منصب "شوریٰ" کو نظر انداز کر کے یہ نہ فرماتے کہ "شوریٰ تو صرف مہاجرین اور انصار کے لیے ہے" اور وہ خلافت قبول کرنے کا مشورہ دینے والوں سے یہ نہ کہتے کہ "یہ معاملہ تمہارے فیصلہ کرنے کا نہیں یہ تو اہل شوریٰ اور اہل بدر کا کام ہے۔" خلفائے راشدین کے تعامل اور ارشادات سے تو یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک اس آیت میں امانت سے مراد حق بالغ رائے دہی نہیں اور نہ ہی وہ تمام اہل ایمان کو شوریٰ کے منصب پر فائز سمجھتے تھے۔

مولانا عبدالستار نیازی سورۃ النساء کی آیت نمبر ۵۸ کے حوالے سے کہتے ہیں "یہاں "کُمْ" جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے جس میں کسی اضافی شرط کو عائد کر کے کسی بھی عاقل و بالغ مسلمان کو اس زمرے سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔" بجا فرمایا اس آیت کے دوسرے حصے میں "تُمْ" جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے جس میں حکم ہے کہ لوگوں کے درمیان عدل سے فیصلے کرو۔ کیا فیصلے کرنے کا اختیار بھی ہر عاقل و بالغ مسلمان کو حاصل ہوگا؟ اگر جواب نفی میں ہے تو یہ تکلف چہ معنی دارد کہ آیت کے اگلے حصے میں اب ان لوگوں سے خطاب کیا جا رہا ہے جو عوام کے حق رائے دہی سے فائدہ اٹھا کر مناصب پر فائز ہو گئے ہیں۔" یہ دراصل تفسیر بالرائے کا کرشمہ ہے ورنہ آیت کے دونوں حصوں میں تمام لوگوں سے بغیر کسی امتیاز کے خطاب ہے اور اس میں امانت اور انصاف سے عام معانی مراد ہیں یا زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس آیت کے دونوں حصوں میں حاکموں سے خطاب ہے جیسا کہ علامہ وحیدالزمان نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے[1] جس کی تائید اس آیت کے شانِ نزول سے ہوتی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرماتے ہوئے کعبۃ اللہ کی چابی عثمانؓ بن طلحہ کے حوالے کی اور فرمایا آج کا دن وفا اور نیکی اور سلوک کا دن ہے (تفسیر ابن کثیر) اس آیت میں امانت اور انصاف کے عام معانی اس طرح ثابت ہوتے ہیں کہ امام بخاری نے اس آیت کو قرض کی ادائیگی کے باب کا عنوان قرار دیا ہے جس کے پیش نظر علامہ وحیدالزمان نے تیسیر الباری ترجمہ صحیح بخاری کے حاشیہ میں لکھا کہ کہ امام بخاری نے اس آیت کو اس لیے عنوان تجویز کیا کہ قرض کی ادائیگی امانت کی ادائیگی سے بھی

---

[1] ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ الخ ـــ ولاۃ امور، والیانِ ملک، امراء و حکام کے متعلق نازل ہوئی ہے (السیاسۃ والشرعیہ)

زیادہ ضروری ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے بھی قرض کو امانت کہا ہے جس کی تائید حضرت براءؓ نے اسی آیت کے حوالے سے کی (تفسیر ابن کثیر) سب سے بڑھ کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی قرض کی ادائیگی کو امانت سے تعبیر کیا ہے (ترمذی) آیت مبارکہ میں امانت اور انصاف کے عام معانی کی تصدیق شاہ عبدالقادر دہلوی کے موضح القرآن سے ہوتی ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ امانت میں خیانت اور جانبدارانہ فیصلہ کرنا یہود کی عادتیں تھیں۔ علامہ شبیر احمد عثمانی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "مسلمانوں کو ان دونوں باتوں سے اس آیت میں روکا گیا"۔ یہاں یہ ذکر بھی بے جا نہ ہوگا کہ امانت کا عام تصور بھی کوئی معمولی چیز نہیں کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تقریباً اپنے ہر خطبہ میں فرمایا کرتے تھے: "اس کا ایمان نہیں جو امانت دار نہ ہو اور اس کا دین نہیں جو عہدوں کو پورا نہ کرتا ہو" (خطبات محمدی جلد اول صلا)

امانت اور بالغ رائے دہی کا تصور

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ امانت — اپنے عام تصور کے ساتھ امامت، خلافت، امارت حکومت اور ذمہ داری کا تصور بھی رکھتی ہے لیکن زیر نظر آیت مبارکہ میں امانت کا اگر یہ تصور بھی لیا جائے تو بھی اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ یہ امانت — امامت، خلافت امارت، حکومت یا کوئی خاص ذمہ داری تفویض کرنے کا حق صرف نبی، امام اور خلیفہ کو حاصل ہے اور عوام اس "امانت" کی ادائیگی کا حق نہیں رکھتے بالفاظ دیگر یہ "امانت" عوام کے پاس نہیں جسے وہ ووٹ کی طرح استعمال کریں اور خود کو قوت کا سرچشمہ تسلیم کرتے پھریں۔

اس آیت مبارکہ سے اس مخصوص امانت کی ادائیگی کے بارے میں یہ نکتہ نظر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث مبارکہ اور خلفائے راشدین کے تعامل کو مدنظر رکھ کر پیش کیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاں امانت کو اس کے مخصوص تصور یعنی — امامت، خلافت اور امارت میں لیتے ہیں وہاں یہ واضح ہدایت بھی کرتے ہیں کہ اس کی ادائیگی کا حق امام، خلیفہ اور امیر کو حاصل ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں امارت کو امانت قرار دیا (مسلم) اور امانت کے ضیاع کی تشریح "جب امر و حکومت اور سرداری نااہلوں کے سپرد کی جائے" ایسے ارشاد سے فرمائی (بخاری) وہاں امارت طلب کرنے پر یہ بھی ارشاد فرمایا "ولایت و حکومت ہم ایسے لوگوں کو نہیں دیتے جو اسے طلب کرتے ہیں" (بخاری و مسلم) یعنی امارت و

ولایت پر مبنی "امانت" دینے اور تفویض کرنے کا حق صرف آپؐ کو اور آپؐ کے بعد خلفاء راشدین کو حاصل ہے جیسا کہ خلفاء راشدین کے تعامل سے ثابت ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسی حق کو استعمال کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا اور حضرت عمرؓ نے اسی حق کے پیش نظر خود میں سے خلیفہ منتخب کرنے کے لیے چھ رکنی کمیٹی تشکیل دی تھی۔

"امانت" تفویض کرنے کا حق کس کو حاصل ہے اس سلسلے میں حضرت عمر فاروقؓ کا یہ ارشاد آج بھی رہنمائی کر رہا ہے جو انھوں نے خلیفہ مقرر کرنے والی کمیٹی تشکیل دینے کے بعد لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "یہ لوگ اپنے میں سے کسی شخص کا انتخاب کر لیں اور جب کسی کو خلیفہ مقرر کریں تو اس کی اچھی طرح حمایت کریں اور اس کے ساتھ مکمل تعاون کریں۔ اگر وہ تمہارے سپرد کوئی کام امانت کے طور پر کرے تو تمھیں اس امانت کو پوری طرح ادا کرنی چاہیے۔" (طبری) یعنی "امانت" تفویض کرنا خلیفہ کا کام ہے اور عوام کی امانت کی ادائیگی کا تصور یہی ہے کہ خلیفہ جس کام کو انجام دینے کا حکم دے اسے بجا لائے حضرت علیؓ کا فرمان ہے کہ "مسلمانوں کے فرماں روا پر یہ فرض ہے کہ وہ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرے اور امانت ادا کرے پھر جب وہ یہ کام کر رہا ہو تو لوگوں پر یہ فرض ہے کہ وہ اس کی سنیں اور مانیں" (کنز العمال بحوالہ خلافت و ملوکیت)

اجماع امت یا کثرت رائے

مولانا عبد الستار نیازی نے کثرت رائے ہی درست (جو کہ حق بالغ رائے دہی تسلیم کرنے کا بدیہی نتیجہ ہے) کا بھی ذکر کیا ہے لیکن وہ دلیل میں وہ حدیث لائے ہیں جس میں ذکر ہے کہ میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی اور پھر فیصلہ کن انداز میں فرماتے ہیں کہ "ایک ایک فرد کا متفق ہونا عقلاً ناممکن ہے اس لیے یہاں (اجماع امت کے بارے میں) تمام ارشادات اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ امت محمدیہ کی اکثریت جس بات پر متفق ہو جائے وہی صحیح ہے۔" حقیقت یہ ہے کہ اجماع امت کثرت رائے نہیں، امت کا ایک رائے پر متفق ہونے کا نام ہے جیسا کہ مقدمہ عالمگیری میں اس حدیث کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے کہ "میری امت کا اتفاق کسی گمراہی پر نہ ہو گا"۔ شرح وقایہ میں ہے کہ "اصول فقہ ہے کہ خلاف ایک شخص کا بھی مانع اجماع ہے اور اجماع نہیں ہوتا مگر سب کے اتفاق سے" دوسری طرف امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ "ہر مدعی اجماع کا ذب ہے ممکن ہے اختلاف ہوا ہو اور اسے علم نہ ہوا ہو" (اعلام الموقعین)

یہاں یہ تذکرہ بے جا نہ ہو گا کہ اجماع امت کی حدیث سے کثرت رائے کے حق ہونے کی

دلیل لینا ہی غلط ہے کیونکہ اس حدیث میں تو یہ نکتہ پنہاں ہے کہ اگر کسی وقت کوئی بڑی جمعیت بھی غلط نظریہ اپنالے تو اس وقت بھی اس سے اختلاف کرنے والا اہلِ حق کا گروہ موجود ہوگا - اس نکتۂ نظر کی تائید اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان ارشادات سے بھی ہوتی ہے جن میں فرمایا کہ "میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ رہے گا جو حق پہ ہو کر مقابلہ کرتا رہے گا اور قیامت تک غالب ہوتا رہے گا" (مسلم) مسلم کی ایک اور روایت میں یہ بھی ہے کہ "جو کوئی اس گروہ کا ساتھ چھوڑ دے گا ان (اس گروہ میں شامل لوگوں) کو کچھ بھی ضرر نہیں پہنچا سکے گا۔ حتیٰ کہ خدا کا وعدہ (فنائے دنیا) آجائے گا۔" بخاری میں بھی اس گروہ کا ذکر ہے۔ ابوداؤد میں ایک روایت ہے کہ "تم سے پہلے کے اہل کتاب بہتّر فرقوں میں تقسیم ہوگئے اور میری یہ امت تہتّر فرقوں میں متفرق ہو جائے گی جن میں سے بہتّر جہنمی ہیں ایک جنتی ہے[1]" ترمذی کی روایت میں ہے کہ ناجی فرقہ وہ ہوگا جو اس روش پہ قائم ہو "جس پر آج میں ہوں اور میرے اصحاب ہیں" قاضی عیاض نے بھی شفا میں یہ روایت بیان کی ہے - اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ تمام ارشادات اس امر پر دال ہیں کہ اہلِ حق کی پہچان کثرت نہیں بلکہ ان کا اس روش کو اختیار کرنا ہے جس پہ "آج میں (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوں اور میرے اصحاب ہیں۔" اور حق افراد کی کثرت و قلت کا نام نہیں بلکہ اس نظریہ کا نام ہے جو انھوں نے اپنا رکھا تھا یعنی حضرت علیؓ کے فرمان کے مطابق حق لوگوں کی وجہ سے نہیں پہچانا جاتا بلکہ لوگ حق کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں!

حرفِ آخر کے طور پر یہ بھی پڑھ لیجیے کہ امام ابن حزم کہتے ہیں — لا تجمع امتی علی الضلالۃ کے الفاظ و سند درجہ صحت کو نہیں پہنچتے لیکن اس کا مفہوم اور نتیجہ ان احادیث کی بنا پر جن میں حق پر قائم رہنے والوں کی خبر دی گئی ہے، صحیح اور ثابت ہے۔" (الاحکام بحوالہ منصبِ نبوت - مولانا ابوالحسن علی ندوی)

مولانا عبدالستار نیازی نے کثرتِ رائے حق ہونے کی یہ دلیل بھی دی ہے کہ مومن جس بات کو اچھا سمجھیں وہ خدا کے نزدیک بھی اچھی اور جس بات کو برا سمجھیں وہ خدا کے نزدیک

---

[1] ورنہ حدیث میں اہلِ حق کے گروہ سے نکلنے والے لوگوں سے اس گروہ کو نقصان پہنچنے کا ذکر ہوتا اور دوسری حدیث میں ایک کے مقابلے میں ۷۲ کے جہنمی ہونے کا تذکرہ نہ ہوتا۔

بھی برگما ہے"۔ غرض ہے کہ یہ حدیث نہیں بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول ہے (درمختار) اور اس سے مراد حضرت عبداللہ بن مسعود نے مومنوں کی صحابہ سے تفسیر فرمائی ہے اس واسطے کہ وہی بالقطع مومنین ہیں قرآن کے اجماع پر مومنین کا اجماع صادق ہے۔ یہیں سے ہی ظاہر ہوا کہ بعض نادان جو اکثر اختراعات پر بیس بیس ہزار مسلمانوں کا اجماع حجت قرار دیتے ہیں یہ خطا در خطا ہے" (مقدمہ عالمگیری) مقدمہ عالمگیری میں ہی ہے کہ اس قول سے اجماع مومنوں کا مراد نہیں بلکہ اجماع صحابہؓ کا مراد ہے اس لیے بدعت حسنہ حجت کے لائق نہ رہی"۔ پھر جس حدیث میں ایک سے دو، دو سے تین، تین سے چار کے بہتر ہونے کا ذکر ہے[2] اس سے مراد ان کی رائے نہیں بلکہ اجتماعی جدوجہد کے بہتر ہونے کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے ورنہ میدان کربلا میں حرؓ کے مقابلے میں کتنے تھے اگر" اکثریت کے فیصلے اقلیت کے فیصلے سے بہتر ہونا اس حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے"۔ تو واقعہ کربلا کے بارے میں کثرت و قلت کے حوالے سے فیصلہ صادر کرنے میں کون سی چیز حائل ہے اور امام مالک بن انس اور احمد بن حنبل کے روشن کردار کے بارے میں بھی کچھ ارشاد فرمائیے۔

نئی شرعی اصطلاح اور صحابہ

مولانا عبدالستار نیازی نے کثرت رائے کے درست ہونے کے سلسلے میں "علیکم بالجماعۃ" ایسی حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے اور اس کی تشریح یہ کی ہے کہ "اکثریتی طبقہ ہی اصطلاح شرع میں جماعت کہلاتا ہے"۔ جماعت کے بارے میں اس شرعی اصطلاح کا ہمیں آج علم ہوا ہے ورنہ ہم تو یہی سمجھتے تھے کہ جماعت کی شرعی اصطلاح ——————————— وہی درست ہے جو حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بیان کی ہے ———

---

[1] حضرت علیؓ تو مومنوں کی رائے سے مراد ہی مہاجر و انصار صحابہ لیتے ہیں۔ تفصیل کے لیے حضرت معاویہؓ کے نام حضرت علیؓ کا خط ملاحظہ کیجیے جس کا گذشتہ صفحات میں تکرار سے ذکر ہوا ہے۔

[2] مولانا عبدالستار نیازی نے پوری حدیث بیان نہیں کی، یہ کثرت رائے نہیں، اجماع امت سے متعلق ہے پوری حدیث یہ ہے اثنان خیر من واحد وثلاثہ خیر من اثنین واربعۃ خیر من ثلاثہ فعلیکم بالجماعۃ، فان اللہ لن یجمع امتی الا علی ھدی۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ امت اکثریت کا دوسرا نام نہیں۔

کیونکہ یہ شاگردانِ رسولؐ، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منشا کو ہم سب سے بہتر جانتے تھے چنانچہ حضرت علیؓ کا — اہل سنت کون ہیں؟ — کے جواب میں ارشاد ہے کہ "وہ جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو مضبوط تھامنے والے ہیں، گو تعداد کے لحاظ سے تھوڑے ہی ہوں" (منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ "جمہور (جماعت) وہ ہے جو جو حق سے جدا ہو گئی ہو، جماعت وہ ہے جو حق کے موافق ہو خواہ تو اکیلا ہی کیوں نہ ہو۔" دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا "افسوس جمہور انسان جماعت سے جدا ہوتے ہیں۔ جماعت انہی کو کہتے ہیں جو مطابق طاعتِ خدا ہو" (بیہقی بحوالہ اعلام الموقعین)

اکثریت دلیل حجت نہیں ہو سکتی، کے سلسلے میں جو آیات قرآنی پیش کی جاتی ہیں ان کے بارے میں مولانا عبدالستار نیازی فرماتے ہیں کہ اس قسم کی وہ تقریباً تمام آیات کا مصداق کفار و مشرکین اور منافقین تھے۔ لیکن یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں رہنی چاہیے کہ جہاں ان آیات میں خطاب مخصوص لوگوں (کفار، یہود اور مشرکین) سے ہے وہاں اکثریت کے ناسمجھ، ناشکرے، بے علم، آیاتِ الٰہی سے غافل اور مشرک ہونے کا تذکرہ ایک خاص اصول کے طور پر کیا گیا ہے۔ ورنہ ان آیات کے قیامت تک کے محفوظ رکھنے کی کوئی تُک اور حکمت نہیں۔ امام ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ "بہت سے واقعات کے بیان کے بعد ہر واقعہ کے ساتھ قرآن نے فرمایا ہے کہ گو اس میں بڑا نشان ہے لیکن پھر بھی اکثر لوگ ماننے والے نہیں" (تفسیر ابن کثیر) مختلف آیات کے آخری فقروں میں اکثریت سے متعلق قرآن کے تاثرات کو تو ان آیات میں مخاطب افراد تک محدود بھی رکھا جائے تو بھی میں کہنا چاہوں گا کہ قرآن نے "اکثریت کے درست ہونے کے دعوٰی کی تردید ایک اصول کے طور پر کی ہے کیونکہ قرآن نے جہاں مشرکین کے اس مفروضہ کہ "تم لوگ خدا کا مارا ہوا جانور نہیں کھاتے اور اپنا مارا ہوا کھا لیتے ہو" کی تردید کی ہے (الانعام ۱۱۸، ۱۱۹) وہاں ان کے اس مفروضہ پر مبنی دعوٰی کی بھی تردید کی ہے کہ — چونکہ ہم تعداد میں تم سے زیادہ ہیں اس لیے تم کو چاہیے کہ ہمارے مذہب کو اختیار کرو (معالم) چنانچہ اس دعوٰی پر یہ آیت نازل ہوئی کہ "اگر آپ ان لوگوں کے کہنے پر چلے جو زمین میں زیادہ ہیں تو وہ آپ کو خدا کی راہ سے بہکا دیں گے" (الانعام: ۱۱۶)

اجماعِ امت اور جماعت کی غلط تاویل کرتے ہوئے یہ مفروضہ بھی درست نہیں کہ "امتِ محمدیہ کی اکثریت جس بات پر متفق ہو جائے وہی صحیح ہے" کیونکہ قرآن نے جہاں حضرت یعقوبؑ

کی امت کے دس افراد — چونکہ — ان کے بیٹے ہی تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے مقابلے میں ایک اکثریت تھے — کو بے علم قرار دیا ہے (یوسف : ۲۱) وہاں امتِ محمدیہ کی اکثریت کے اس فیصلہ کو بھی بنظرِ استحسان نہیں دیکھا جس کی وجہ سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہر کی بجائے میدان میں جنگ لڑنی پڑی نہ ہی اکثریت کے اس واقعہ کو قابلِ استحسان گردانا گیا جس کی وجہ سے احد کی جیتی ہوئی جنگ وقتی طور پر شکست میں تبدیل ہو گئی اور نہ ہی حدیبیہ کے مقام پر اکثریت کے فیصلے سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پریشانی لاحق ہوتی اور نہ وہ امتِ محمدیہ کی اکثریت کے فیصلے کا شکوہ اُمّ المومنین ام سلمہؓ سے کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ اسامہؓ کو سردارِ لشکر بنانے کے سلسلے میں اکثریت کا ردِ عمل اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وضاحت کے لیے خطبہ دینے پر مجبور نہ کرتا اور نہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیدیوں کی رہائی کے سلسلے میں حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ اور حضرت سعدؓ بن معاذ ایسی اکثریت کے مقابلے میں صرف حضرت ابو بکر صدیقؓ کی رائے تسلیم کرتے، حضرت ابو بکرؓ زکوٰۃ کی وصولی کے بارے میں تمام صحابہ کرام کی رائے کو بھی نظر انداز نہ کرتے اور حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی اکثریتی رائے کی بجائے تنہا حضرت عثمانؓ کی رائے پر عمل نہ کرتے ! اب آخر میں کنز العمال جلد اول میں درج حضرت عمرؓ سے مروی یہ حدیث پڑھ لیں کہ "جب بھی کسی نبیؐ کے بعد اس کی امت نے اختلاف کیا تو اہلِ باطل اہلِ حق پر غالب رہتے ہیں"۔ اہلِ حق پر اہلِ باطل کا غلبہ بظاہر اور تعداد کے لحاظ سے ہی ہوتا ہے۔

بھول بھلیاں

جمہوریت کو اسلامی بنانے کی کوشش کے تذکرہ اور اس پر تبصرہ کے بعد میں مولانا امین احسن اصلاحی کے شاگردِ رشید جناب جاوید احمد کی تصریحات کے بارے میں بھی کچھ کہنا چاہوں گا جنھوں نے جمہوریت کو ضلالت اور گمراہی تو قرار دیا ہے لیکن ان عوامل کو اسلامی ثابت کرنے کی کوشش کی جس پر جمہوریت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ وہ اپنی تصنیف "اسلام کا سیاسی نظام" میں لکھتے ہیں کہ آیتِ زیرِ بحث — امرھم شوریٰ بینھم — میں "شوریٰ فعلیٰ" کے وزن پر مصدر ہے اور اس کے معنی — مشورہ کرنے کے ہیں — اس مصدر کے خبر واقع ہونے اور اس کے ساتھ "بینھم" کے اضافے سے اس جملے کا مفہوم اب وہ نہیں رہا جو "شاورھم فی الامر